# کچھ قومیں کام کرتی ہیں—دوسری محض امید پر جیتی ہیں

ترقی کوئی خیرات نہیں ہے۔ اسے تعمیر کیا جاتا ہے۔

جب کوئی قوم نعروں پر نظم و ضبط کو، خالی امیدوں پر جدوجہد کو، اور محض تسلی پر غور و فکر کو ترجیح دیتی ہے، تو اس کا مستقبل بدل جاتا ہے۔ ایمان محنت کی جگہ نہیں لیتا—بلکہ اسے وقار عطا کرتا ہے۔ عروج پانے والوں اور جمود کا شکار رہنے والوں کے درمیان فرق سادہ سا ہے: کچھ لوگ معجزوں کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔جبکہ دوسرے ہر صبح بیدار ہو کر خاموشی، یکسوئی اور انتھک محنت سے (اپنے خواب) تعمیر کرتے ہیں۔ تاریخ صرف ہمارے ان کاموں کا جواب دیتی ہے جو ہم حقیقت میں انجام دیتے ہیں۔

میں نے یہ سوال عقیدت اور بے چینی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ پوچھا۔ "انہوں نے یہ سب کیسے کیا؟" میں نے کہا۔ "چین نے گزشتہ پچاس برسوں میں جو کچھ حاصل کیا ہے—کروڑوں لوگوں کو غربت سے نکالنا، وسیع بنیادی ڈھانچہ (Infrastructure) تعمیر کرنا، اور ایک عالمی معاشی قوت کے طور پر ابھرنا—یہ سب تقریباً ناقابلِ یقین لگتا ہے۔ نہ کوئی خدائی دعویٰ، نہ کوئی خاص روحانی بیانیہ، نہ کوئی جذباتی نعرے، اور پھر بھی یہ حیران کن ترقی۔ آخر کیسے؟"

انہوں نے ہچکچاہٹ کے بغیر جواب دیا۔ "انہوں نے ایک وژن (Vision) کے ساتھ کام کیا،" انہوں نے جواب دیا۔ "اور اس سے بھی اہم بات یہ کہ انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ انہیں کس چیز کی ستائش کرنی ہے۔"

یہ جواب شروع میں بہت سادہ بلکہ غیر تسلی بخش محسوس ہوا۔ میں جغرافیائی سیاست (Geopolitics)، سازشوں یا کسی پوشیدہ فوائد کی توقع کر رہا تھا۔ انہوں نے آہستہ سے سر ہلایا، جیسے وہ میری ذہنی مزاحمت کو پڑھ رہے ہوں۔

"ترقی شاذ و نادر ہی کسی پرسراریت سے جنم لیتی ہے،" انہوں نے کہا۔ "یہ تو واضح مقصد (Clarity) سے آتی ہے۔" چین کا عروج کسی مقدس بنیاد یا غیر معمولی تقدیر کی وجہ سے نہیں ہوا۔ یہ اس لیے ابھرا کیونکہ اس نے ایک اجتماعی فیصلہ کیا تھا: **ہم تعمیر کریں گے۔** اس نے اپنی

تعریف و تحسین کے معیار بدل دیے۔ اس نے اپنے عوام سے وابستہ توقعات کو بدل دیا۔ سخت محنت اب محض ایک انتخاب نہیں رہی بلکہ ایک مشترکہ اخلاقی قدر بن گئی۔ قومی ترقی اب محض ایک نعرہ نہیں بلکہ ایک عملی ترجیح بن گئی۔

"اور یہی وہ چیز ہے،" انہوں نے کہا، "جو سب کچھ بدل دیتی ہے۔"

میں نے سوچا کہ ہم کتنی بار شارٹ کٹ، خصوصی دعاؤں، بیرونی نجات دہندگان اور معجزاتی تبدیلیوں کی تلاش میں رہتے ہیں—جبکہ افرادی صلاحیت سازی کے سست اور صبر آزما کام کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ان کا لہجہ اب نرم ہو گیا تھا، جو مروت کی بنا پر نہیں بلکہ تشویش کی وجہ سے تھا۔

"ہم ایک جذباتی قوم ہیں،" انہوں نے کہا۔ "اور جذبات جب غور و فکر کے تابع نہ ہوں، تو وہ ذمہ داری کا نعم البدل بن جاتے ہیں۔" انہوں نے مجھے یاد دلایا کہ ہم کتنی آسانی سے ماضی کے بیانات سے چمٹ جاتے ہیں، اور طاقتور الفاظ کو بار بار دہراتے ہیں جیسے وہ مستقبل کی ضمانت ہوں۔ ہم ان باتوں سے تسلی پاتے ہیں جو کبھی کہی گئی تھیں، چاہے حقیقت ان سے کہیں آگے نکل چکی ہو۔

"ذرا تصور کریں،" انہوں نے خاموشی سے کہا، "آج بھی اس اعلان سے ڈھارس باندھنا کہ کوئی طاقت کسی قوم کو مٹا نہیں سکتی—جبکہ تاریخ اس کے برعکس ثابت کر چکی ہو۔" یہ بات تکلیف دہ تھی کیونکہ یہ سچ تھی۔ ہم اصلاح سے زیادہ تسلی چاہتے ہیں۔ ہم اسباب تیار کیے بغیر نتائج کی دعائیں مانگتے ہیں۔ اور جب حالات نہیں سدھرتے، تو ہم باہر کی طرف دیکھتے ہیں—تقدیر، دشمنوں، سازشوں کی طرف—سوائے اپنے گریبان کے، ہر طرف۔

انہوں نے ٹیک لگائی اور ایک ایسی بات کہی جس نے پورے منظر نامے کو بدل کر رکھ دیا۔

"خدا کا دنیا میں رائج نظام جذباتی نہیں ہے۔ یہ علتی (Causal) ہے یعنی اسباب و اثرات پر مبنی ہے۔"

انہوں نے وضاحت کی کہ غیبی مدد کوششوں کے متوازی نہیں چلتی، بلکہ ان کے ذریعے کام کرتی ہے۔ اسباب اور ان کے اثرات ایمان کے متصادم نہیں ہیں؛ بلکہ یہ اسی کا حصہ ہیں۔ اگر کوئی معاشرہ نظم و ضبط، منصوبہ بندی، مہارت اور استقامت پیدا کرتا ہے، تو نتائج بدل جاتے ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہوتا، تو محض پر کشش تقاریر اس کا ازالہ نہیں کر سکتی۔

"دعا، تیاری کا متبادل نہیں ہے،" انہوں نے کہا۔ "یہ اسے وقار عطا کرتی ہے۔"

مجھے دو طالب علم یاد آئے جنہیں میں کبھی جانتا تھا۔ ایک مسلسل کامیابی، مقدر اور صلاحیتوں کی باتیں کرتا رہتا تھا۔ دوسرا خاموشی سے روزانہ پڑھتا تھا—تھوڑا تھوڑا کر کے خود کو بہتر بناتا، ناکام ہوتا اور پھر خود کو ڈھال لیتا۔ برسوں بعد، ان کے درمیان فرق ٹیلنٹ یا ذہانت کا نہیں تھا۔ یہ ان کے رویے کا فرق تھا۔ ایک صرف امید لگائے بیٹھا رہا، دوسرے نے کام کیا۔

"قومیں بھی اسی طرح کا رویہ اختیار کرتی ہیں،" انہوں نے کہا۔ "جب نظریات بدلتے ہیں، تو طرزِ عمل بدل جاتا ہے۔ جب طرزِ عمل بدلتا ہے، تو نتائج سامنے آتے ہیں۔ لیکن جذباتی اور بے پرکھے نظریات سے کوئی پائیدار چیز جنم نہیں لیتی۔"

جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ ان کا 'غور و فکر' پر اصرار تھا—نہ کہ مایوسی یا قنوطیت پر۔ محض غور و فکر۔

"تکلیف دہ سوالات پوچھیں،" انہوں نے کہا۔ "ہم کسے سراہتے ہیں؟ ہم کس چیز کا عذر پیش کرتے ہیں؟ ہم کس چیز کا جشن مناتے ہیں؟ اور ہم کیا برداشت کرتے ہیں؟" ان کا ماننا تھا کہ ان سوالات کے جوابات کسی قوم کے مستقبل کے بارے میں اس کی تقریروں یا دعاؤں سے کہیں زیادہ حقائق بیان کرتے ہیں۔

انہوں نے ایک ایسی تنبیہ پر بات ختم کی جو میرے ذہن میں نقش ہو گئی:

**"ایک پُرامید قوم جو کام کرنے سے انکار کر دے، وہ آخر کار اپنی امید بھی کھو بیٹھتی ہے۔ ایک کام کرنے والی قوم، چاہے اس کے پاس نعرے نہ ہوں، اپنا مستقبل خود تعمیر کر لے گی۔"**

جب میں ان کی باتوں پر غور کرنے بیٹھا، تو مجھے احساس ہوا کہ ہم اکثر جذباتی تسلی کو ایمان، اور ماضی کی یادوں (Nostalgia) کو وژن سمجھنے کی غلطی کرتے ہیں۔ ہم تکلیف کے بغیر ترقی، نظم و ضبط کے بغیر وقار، اور اسباب کے بغیر نتائج چاہتے ہیں۔ لیکن دنیا اس طرح کام نہیں کرتی۔

کچھ قومیں صرف امید لگائے رکھتی ہیں۔ دوسری خاموشی سے تعمیر کرتی ہیں۔ تاریخ ہمارے جذبات سے بے نیاز ہوتی ہے۔ یہ صرف اس چیز کو اہمیت دیتی ہے جسے ہم تعمیر کرتے ہیں۔